مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)

امام ابوحنیفہؒ کا بگڑی حکومتوں کے خلاف اقدام

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (م ۱۹۵۶) کی معروف کتابوں میں سے ایک ''حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی'' ہے۔ یہ مولانا علیہ الرحمہ کی تقریباً ساٹھ (۶۰) برس پہلے کے اس زمانہ کی تصنیف ہے جب آپ کے مضامین کی اشاعت خاص طور پر الفرقان کے حصہ میں آتی تھی اور پھر ان میں بہت سے مضامین کتابی شکل میں بھی اولاً ادارہ الفرقان ہی سے نکلے۔ خود اس کتاب کا ابتدائی حصہ بھی اولاً الفرقان ہی میں نکلا۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا تھا کہ مکمل کتابی شکل میں بھی اسے پڑھا ہو اور پڑھی بھی ہو تو میرا حافظہ ایسا نہیں کہ اتنے زمانہ کی چیز بھی ضروری تفصیلات کے ساتھ ذہن میں رہ جائے' اس وقت سلفیت کے نام سے جو ''سفاہت'' خاص سعودی عرب کے اندر دیکھنے میں آرہی ہے کہ جو حکومت اس کی سرپرست اور پناہ گاہ رہتی آئی تھی خود اسی پر یہ ''سلفیت'' الٹ پڑی ہے' اسی کا دوسرا رخ حنفی فقہ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ پر اس کی وہ مجنونانہ چاند ماری ہے کہ ہم جیسے بھی' جو بس عمل کی حد تک حنفی تھے' اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے' اسی سلسلہ میں مولانا کی یہ کتاب یاد آئی تھی کہ کہیں ملے تو پڑھی جائے۔

گزشتہ دنوں محب محترم مولانا یعقوب قاسمی صاحب کی طرف کا سفر ہوا تو وہاں یہ کتاب ملی۔ مولانا کے پاس کتابوں کا ماشاء اللہ متنوع ذخیرہ ہے۔ اکثر ضرورت کی چیزیں وہاں مل جاتی ہیں۔ ساڑھے پانچ سو صفحے کی کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن تھا جو نفیس اکیڈمی کراچی سے ۱۹۶۰ء میں طبع ہوا۔ کتاب مولانا کے معروف طرز تحریر کا پورا پورا نمونہ ہے۔ موضوع سے دور قریب کی کیسی بھی مناسبت بھی کوئی بات اگر رکھتی ہے تو متن میں گر نہیں تب حاشیہ میں مذکور ہونے سے وہ نہیں رہ پائے گی۔ کتاب کے تعارف نگار ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب مرحوم نے اسی حقیقت کو بایں الفاظ ادا فرمایا ہے کہ ''قدیم زمانے کے اسلامی علماء کی طرح زیر نظر کتاب جامع ضرور ہے مگر مانع نہیں۔'' اصل میں مولانا کا علم ایک بحر مواج کی کیفیت رکھتا تھا کہ مضامین و نکات امنڈتے اور مولانا کے قلم کو بہالے جاتے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ واعلیٰ درجتہ۔

اس کتاب کی رو سے یوں تو امام صاحب کی زندگی کے عبادتی مشاغل کو چھوڑ کر' باقی تمام ہی مشاغل اس معنی میں ''سیاسی'' قرار پاتے ہیں کہ ان کا محرک اور مقصد' مصنف کے نقطہ نظر سے' حکومت وقت کے بگاڑ کو اپنے امکان بھر دور کرنا تھا۔ لیکن عرفی اور اصطلاحی معنی میں بس ایسے دو تین واقعے کتاب میں ملتے ہیں جن کو آپ کی سیاسی زندگی کے مظاہر کہا جائے۔ ایک ۱۲۲ھ میں وقت کی اموی حکومت کے مقابلہ پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن علی زین العابدین رضی اللہ عنہما کے خروج پر آپ کا رویہ۔ پھر ۱۴۵ء میں عباسی حکومت کے خلاف حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پر

پوتے محمد بن عبداللہ اور انکے بھائی ابراہیم بن عبداللہ کے خروج پر آپ کا موقف اور ان دونوں موقعوں کے درمیان میں اسوقت جب کہ عباسیوں کی حکومت ابھی قائم ہی ہوئی تھی اور اس انقلاب حکومت کا ہیرو ابومسلم خراسانی نئی حکومت کی جڑیں جمانے کے سلسلے میں بے دریغ شمشیر آزمائی لوگوں پہ خوف طاری کرنے کیلئے کر رہا تھا' اس وقت فقہائے خراسان کی ایک بزرگ اور بے چین روح شخصیت ابراہیم بن مأمون الصائغ نے بار بار کوفہ آ کر اس ظالم حکومت کے خلاف کھڑے ہونے کے سلسلہ میں امام صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ کتاب کے ان تینوں موقعوں سے گزرتے ہوئے امام صاحب کا جو طرز عمل سامنے آیا اس میں ہمارے آج کے بعض خاص حالات کیلئے ایسا برمحل اور صاف وصریح پیغام لکھا دکھائی دیا کہ دل بے اختیار پکار اٹھے: مؤذن مرحبا بروقت بولا تری آواز مکے اور مدینے

یہی پیغام ہے جو ان سطور کا محرک ہوا۔

ان تین مواقع میں سے پہلا موقع یعنی حضرت زید بن علی زین العابدین کا خروج بہ مقابلہ بنوامیہ اور حضرت امام کا رویہ۔ اس کی تفصیل کتاب کے مطابق یہ ہے کہ بنوامیہ کی حکومت میں یوں تو اس کا سوال ہی نہ تھا کہ اہل بیت میں سے کوئی کوفہ میں قدم رکھ سکے۔ مگر تقدیر ہر چیز پر غالب ہوتی ہے' خود حکومت دمشق ہی آپ کے کوفہ پہنچنے کا ذریعہ بن گئی۔ اور وہاں کے لوگ حسب عادت اظہار عقیدت اور اموی حکومت سے اظہار بیزاری کے لئے ٹوٹ پڑے۔ عوام تو عوام مولانا لکھتے ہیں کہ خواص اہل علم تک میں جو زیادہ جوشیلے تھے "انہوں نے تو علانیہ حضرت زید کی طرف سے بیعت لینی شروع کر دی۔" اور اس کے نتیجہ میں "چالیس ہزار انسانوں نے حضرت زید کے ساتھ مل کر بنی امیہ کی حکومت سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔" (ص ۱۴۷) لیکن امام ابوحنیفہ جن کے کوفہ میں یہ سب ہو رہا تھا اور خانوادۂ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپ کا جو عقیدتمندانہ تعلق تھا وہ ایک معلوم ومعروف حقیقت' نیز خود حضرت زید کی ذات کے بارے میں آپ کے جن احساسات کا حوالہ مولانا نے اس روایت کے الفاظ سے دیا ہے کہ: "میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا جیسے ان کے خاندان کے دوسرے حضرات کے مشاہدہ کا موقع مجھے ملا۔ میں نے ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ فقیہ آدمی اور کسی کو نہیں پایا اور ان جیسا صاحب علم' حاضر جواب اور صاف واضح گفتگو کرنے والا آدمی اس عہد میں مجھے کوئی نہ ملا۔ درحقیقت ان کے جوڑ کا آدمی اس زمانہ میں نہ تھا۔" (ص ۱۳۷) اس سب کے باوجود ہم نہیں پاتے کہ حضرت امام آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہوں۔ بلکہ خود حضرت زید کی طرف سے ایک قاصد آپ کے پاس حمایت طلبی کی غرض سے جاتا ہے۔ ارسل الی ابی حنیفۃ یدعوہ الی نفسہ' (آپ نے اپنی بیعت کی دعوت دینے کے لئے ابوحنیفہ کے پاس قاصد بھیجا۔ ص ۱۵۱) اور اس پر بھی ہم صرف اتنا پاتے ہیں کہ حضرت امام صرف کچھ مالی اعانت کی شکل میں حمایت فرما رہے ہیں' اس سے زیادہ نہیں۔ فضیل بن زبیر جو کہ قاصد تھے بتاتے ہیں کہ آپ نے "ہزار ہزار کی دس تھیلیاں لاکر ان کے حوالہ کیں اور فرمایا: میں اس مال سے حضرت کی خدمت کرتا ہوں' عرض کرنا کہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اس سے بھی فائدہ حاصل کریں۔" (ص ۱۶۵) اور اس سے زیادہ کرنے سے معذرت کے طور پر فرمایا کہ "اگر میں یہ جانتا

کہ لوگ حضرت کو چھوڑ نہ دیں گے اور یہ کہ حضرت کے ساتھ واقعی سچائی کیساتھ لوگ کھڑے ہونگے تو میں ضرور آپ کی ہمرکابی اختیار کرتا اور آپ کے مخالفین کے ساتھ جہاد کرتا کیونکہ آپ امام برحق ہیں۔(۱۶۱) واقعہ کی یہ صورت کہ "امام برحق" مان کر بھی ہمرکابی سے معذرت خواہی ہے' قدرتی طور پر جو سوال پیدا کرتی ہے اس سوال کے جواب ہی میں ہمارے لئے حضرات امام کا پیغام مضمر ہے اور وہ سوال اور بھی گھمبیر ہو جاتا ہے جب اسی سلسلہ کی یہ مشہور روایت بھی یاد کرلی جائے کہ حضرت امام نے حضرت زید کی اس جہادی مہم کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ خروجة یضاھی خروج رسول اللہ ﷺ یوم بدر "آپ کا اس وقت اٹھ کھڑا ہونا رسول اللہ ﷺ کی بدر میں تشریف بری کے مشابہ ہے" (ص ۱۵۱) زیدی خروج وجہاد کے بارے میں یہ تأثر اور پھر بھی ساتھ کھڑے ہونے سے معذرت! لیکن اس سوال کے جواب کی بات باقی دونوں واقعات کے بعد!

حضرت زید کے خروج کے بعد نو دس برس کا عرصہ گزرتا ہے کہ (۱۳۲ھ میں) بنوامیہ کی جگہ بنوعباس تختِ خلافت پر قابض ہو جاتے ہیں۔ بنوعباس کے حق میں ہونے والے اس انقلاب کا ہیرو ابومسلم نامی ایک خراسانی ہے۔ خراسان کا پورا علاقہ اس کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے' وہ ان تمام لوگوں کے لئے بلائے بے درماں بنا ہوا ہے جن کی اطاعت کے بارے میں ذرا سے شبہ کی بھی گنجائش پاتا ہے۔ چاہے ان کا کوئی بھی تعلق بنوامیہ کی ہم نوائی سے نہ ہو۔ اس طرح خلقِ خدا شدید ظلم وستم کا شکار ہے۔ اس علاقہ کے وہ بزرگ جن کا نام اوپر گزرا یعنی شیخ ابراہیم بن میمون' ان کے اگرچہ بڑے اچھے مراسم ابومسلم سے چلے آتے تھے کہ وہ ایک علمی آدمی بھی تھا۔ ان شیخ ابراہیم نے اس کی اس تازہ روش پر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ حکومت کے نشہ میں آچکا تھا۔ اور واقعہ میں اب بنوعباس کا داعی اور خدمت گزار نہیں بلکہ خود صاحب سلطنت بن جانے کے خوابوں میں تھا۔ اس نے ایک نہ سنی تو شیخ ابراہیم نے طے کیا کہ اب دوستی کی جگہ دشمنی ہے۔ مگر کیا کریں اور کیسے کریں؟ اس کے لئے امام صاحب کی طرف رجوع ہوئے' وہ پہلے سے مسائل کے سلسلہ میں امام صاحب سے رجوع کرتے آئے تھے کہ امام صاحب پورے معنی میں فقیہ تھے اور یہی وہ راز تھا کہ حضرت سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک جیسا جلیل القدر معاصرین نے "کان رفقہ اہل الارض فی زمانہ" کہہ کر اپنے وقت کی دنیا کا فقیہ اعظم ان کو بتایا ہے۔ (ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۰) پورے معنی میں فقیہ کا مطلب؟ بھرپور علمِ دین کے ساتھ بھرپور دانش وہوش گوش سے بھی بہرور۔ اس کے بغیر آدمی اس درجہ کا مجتہد نہیں ہوتا کہ جو اہل علم اس کی فقہ کے پیرو بھی نہیں ہیں وہ بھی اسے "امام اعظم" ہی کے لقب سے بالعموم یاد کریں۔ الغرض ابراہیم بن میمون اپنے خراسانی شہر مرو سے سفر کر کے حضرت امام کے پاس پہنچے اور حالات بتا کر ابومسلم کے خلاف اقدام میں آپ کی قیادت کے طالب ہوئے۔ یعنی آپ قیادت قبول فرمائیں اور پھر عمل کے لئے منصوبہ بنے اور یہ کام ایک بار نہیں بار بار ہوا۔

مولانا بتاتے ہیں کہ حالات کی جو نوعیت شیخ ابراہیم نے بار بار آپ کی خدمت میں تشریف لا کر بیان کی تو آپ' جو کہ خود بھی حالات پر نظر رکھتے تھے' شیخ ابراہیم کے اس موقف سے اختلاف نہ کر سکے کہ ایسے حالات کو بدل دینے

کے لئے کھڑا ہونا ایک شرعی تقاضہ اور حقوق اللہ میں سے ایک حق ہے' لیکن ابراہیم کی شدت احساس انہیں معاملہ کے اس پہلو پر توجہ کا موقع نہیں دے رہی تھی کہ یہ وہ فریضہ نہیں جو نماز روزہ کی طرف افراد کے ذمہ عائد ہوتا ہو' اس کی ادائیگی ایک اجتماعی و تنظیمی طاقت چاہتی ہے۔ اس لئے آپ نے ان کو سمجھایا کہ "اس حق کو ادا کرنے کے لئے ایک دو آدمی اگر کھڑے ہوں گے تو قتل کر دیئے جائیں گے اور مخلوق خدا کے لئے کام کی کوئی بات انجام نہ دے سکیں گے۔" فرمایا: بلاشبہ یہ فرض ہے لیکن ایسا فرض نہیں جس کے لئے تنہا ایک آدمی کھڑا ہو جائے۔" (ص ۲۴۹) اور جو کہیں خیال پیدا ہو کہ انبیاء علیہم السلام جن کے ہم وارث ہیں وہ تو دنیا کے مقابلہ میں اکیلے ہی کھڑے ہوتے نظر آئے' تو اس معاملہ کی حقیقت واضح کرنے کیلئے بھی فرمایا کہ: ما اطاقته الانبیاء حتی عقدت علیهم من السماء ۔ پیغمبروں کیلئے بھی یہ صورت حال اسی وقت قابل برداشت ہوئی ہے جب آسمان پر ان کے لئے عہد باندھا گیا۔" اس کی تشریح میں مولانا ارقام فرماتے ہیں: "مثلاً موسیٰ علیہ السلام کو جب فرعون کے مقابلہ میں بھیجا جا رہا تھا' حالانکہ بھیجنے والا قادر مطلق تھا' پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بشری احساس کا اظہار بارگاہِ رب العزت میں بایں الفاظ فرمایا: "ربنا انا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغیٰ ۔ جس پر حق تعالیٰ کی طرف سے بایں الفاظ (اطمینان دلایا گیا) کہ: لاتخافا انني معکما اسمع واریٰ۔ تم دونوں کسی قسم کا اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کیساتھ ہوں سن رہا اور دیکھ رہا۔" (ص ۲۵۰)

الغرض اصولی طور پر ابراہیم بن میمون سے متفق ہوتے ہوئے اور انکے بے حد قدرداں بھی ہوتے ہوئے حضرت امام نے ان کے اس خیال کی تائید کسی طرح نہیں کی کہ جب فرض پکار رہا ہے اور کوئی بڑی اجتماعی اور تنظیمی طاقت مہیا کرنے کے حالات نہیں ہیں تو جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ تو کیا ہی جائے۔ شیخ ابراہیم کا ضرور یہ خیال رہا ہوگا کہ حضرت امام کی شخصیت کے گرد کافی لوگ جمع ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ بار بار مرو سے کوفہ کی طویل مسافت کا سفر کر کے کوفہ پہنچتے تھے۔ اور "ہر بار (بقول امام) وہ ایسا تقاضا کرتے جیسا ایک قرض خواہ اپنے قرض کا تقاضہ کیا کرتا ہے۔" (ص ۲۵۳) مگر حضرت امام اس معاملہ میں "جوئے" کے قائل نہیں تھے کہ ہر چہ باداباد بس چل پڑو۔ صرف یہی تو بنیاد تھی کہ حضرت زید کا ساتھ دینے کا فیصلہ آپ نہیں کر سکے۔ تاہم ابراہیم بن میمون صبر نہ کر سکے اور بقول مولانا "انکا" ایمانی جوش جوش جس خونی تماشہ کے پیش کرنے پر ان کو آمادہ کر رہا تھا اس سے ان کو باز رکھنے میں امام کی فہمائش کامیاب نہیں ہو سکی۔" چنانچہ انہوں نے ابو مسلم سے تنہا ہی جہاد باللسان کر کے اپنے جذبہ شہادت کی تسکین کر لی۔ اعلی اللہ درجاتہ۔

شیخ ابراہیم کی شہادت پر طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۴۶ھ) کا زمانہ اور ۱۴۵ھ ہے۔ ان لوگوں نے بنو امیہ کے خلاف اپنی خفیہ تحریک اہل بیت کے نام پر چلائی تھی۔ مگر کامیابی ہوئی تو نکلا یہ کہ اہل بیت سے ان کی مراد خواجہ ابو طالب کی اولاد نہیں حضرت عباسؓ کی اولاد یعنی وہ خود تھے۔ اس کے نتیجہ میں کچھ تو ہونا ہی تھا۔ اور وہ جو ہوا تھا اس دفعہ حضرت حسینؓ کی نہیں حضرت حسنؓ کی اولاد کے ہاتھوں ہوا۔ بقول مولانا گیلانی "حسینی سادات کے حوصلے اس راہ میں پست ہو چکے تھے۔..... مگر حسنی سادات کی امنگیں ابھی زندہ تھیں۔"

(ص ۳۳۶) حضرت حسنؓ کے پڑپوتے محمد بن عبداللہ (جو نفس زکیہ کے لقب سے معروف ہیں) نے عزم کیا کہ وہ اپنے عمزادوں سے اپنا حق چھینیں گے۔ اور اس میں سارا خاندان ان کے ساتھ تھا۔ ایک بھرپور اور مملکت گیر تیاری' بقول مولانا گیلانی' اس انقلابی جدوجہد کے لئے کی گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں ''محمد النفس الزکیہ کی بیعت میں سارے امصار کے لوگ شریک ہوئے تھے۔'' (ص ۳۳۷) رمضان ۱۴۵ھ میں انہوں نے مدینہ سے خروج کا علم حکومت کے خلاف بلند کیا۔ مگر افسوس کہ ان کی بیعت کرنے والے بھی حضرت زید کے ''جانثاروں'' سے کچھ مختلف نہ نکلے۔ لکھا ہے' خروج کے وقت صرف اصحاب بدر کی تعداد کے برابر آدمی (یعنی دو تین سو) ان کے ساتھ تھے (البدایہ والنہایہ ج ۱۰) اور وہ بھی چھوڑ چھوڑ کے بھاگتے رہے۔ حتیٰ کہ آخر میں تن تنہا لڑتے ہوئے جان دی۔ جعل اللہ الجنۃ مثواہ۔

نفس زکیہ نے خلافت کے ہر صوبے میں اپنے بھائی' بیٹے' بھتیجے بھیجے ہوئے تھے۔ مگر سب اپنی اپنی جگہ گرفتارِ بلا ہوتے گئے۔ اور یہی وجہ تھی کہ خروج نہایت ناموافق حالات میں ہوا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ بالکل مجبوراً ہوا' کوئی راستہ آن کے لئے بجز اس کے نہیں رہ گیا تھا کہ تلوار لیکے قسمت آزمائیں یا خود کو عباسی حکام کے سپرد کردیں۔ (تفصیل البدایہ وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے) نہ معلوم مولانا گیلانی کے بیان میں یہ صورت حال سامنے آنے سے کیوں رہ گئی ہے۔ جس کے سامنے آنے نہ آنے سے اس قصہ سے متعلق اگلی گفتگو پر قدرتی طور سے اثر پڑتا ہے۔ بہرحال آپ کے صرف ایک بھائی ابراہیم بن عبداللہ حکومت کی گرفت میں آنے سے بچ کر بصرہ پہنچ گئے تھے جہاں کا حاکم اندر سے آپ کے گھرانے کا حامی ثابت ہوا۔ یہ چیز امام ابراہیم کیلئے نہایت مددگار ہوگئی' نہ صرف بصرہ میں انہیں کھل کر موقع ملا کہ اپنے لئے ممکنہ طاقت فراہم اور منظم کرلیں' بلکہ آس پاس کے پورے علاقہ میں نفوذ کا موقع بھی مل گیا اور برادر بزرگ نفس زکیہ کے خروج اور ان کی شہادت کی خبر ملنے پر وہ بھی کوفہ پر حملہ کیلئے' جو اس وقت خلیفہ منصور کا مستقر تھا' اپنے ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ نکلے۔ مگر دوسری طرف سرکاری فوج پہلے ہی بصرہ کے لئے روانہ ہوچکی تھی۔ اس سے راستہ ہی میں مڈبھیڑ ہوگئی۔ اور فوج گرچہ صرف پندرہ ہزار تھی۔ تاہم بازی اسی کے ہاتھ رہی۔ اور امام ابراہیم کے ہاتھ وہی شہادت لگی جو اس خانوادہ کا حصہ ہوتی آئی تھی۔..... امام ابراہیم کو بصرہ میں اپنی سرگرمیوں کے لئے کافی وقت ملا تھا اور بصرہ اور کوفہ کا رشتہ ایسا تھا کہ فوراً ہی ایک جگہ کی کسی ایسی بات کے اثرات دوسری جگہ پہنچیں۔ پس اس کا سوال ہی نہ تھا کہ حکومت کے خلاف اہلِ بیت کی سرگرمیوں کے اثرات کوفہ میں نہ پہنچ رہے ہوں۔ اس لئے مولانا گیلانی کا کہنا ہے یہ موقع چونکہ حضرت زید اور شیخ ابراہیم مروانی والے موقعوں کے برعکس طویل اور بھرپور تیاریوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا اور وہ شرائط پوری ہوگئی تھیں جن کی سابق مواقع پر کمی پائی گئی تھی۔ اس لئے حضرت امام نے بھی بلا کسی تحفظ کے امام ابراہیم کی پوری اور پرجوش معاونت کی اور اس موقع پر آپ کا رویہ سابقہ دونوں موقعوں سے مختلف رہا۔ تاہم اس بات سے صرفِ نظر مولانا کے لئے بھی ممکن نہیں ہوا ہے کہ اپنی ذات سے امام صاحب اس موقع پر بھی براہ راست میدان میں نہیں نظر آتے ہیں۔ یعنی اس پہلو سے دیکھا جائے تو بالکل وہی پوزیشن تھی جو حضرت زید کے معاملہ میں آپ نے

اختیار فرمائی تھی۔ یعنی آپ کو "امام برحق" تک کہا' مالی امداد پیش کی تا کہ آپ کے ہاتھ مضبوط ہوں' مگر ساتھ کھڑے ہونے سے معذرت کی۔ لیکن مولانا کے نزدیک چونکہ اس موقع پر تمام شرائط پورے ہو گئے تھے اس لئے حضرت امام کی ذاتی عدم شرکت کی وجہ ان کے نزدیک محض کوئی معذوری اور مجبوری ہی ہو سکتی تھی نہ کہ قصد وارادہ۔ چنانچہ آپ نے مختلف قسم کی امکانی مجبوریوں کی طرف اشارے کر کے اس مسئلہ کو قیاسی طور پر حل کیا ہے۔

ہو سکتا ہے واقعہ یہی ہو لیکن ہمارے خیال میں اس بات کے قرائن موجود ہیں کہ آپ کی عدم شرکت یہاں بھی اسی بنیاد پر ہو جس بنیاد پر اس سے پہلے مواقع میں ایسا ہوا تھا۔ اور یہ قرینہ حضرت نفس زکیہ کے خروج کی اس صورتحال میں ہے جس کی طرف اشارہ کر کے ہم نے اوپر کہا ہے کہ "نہ معلوم مولانا گیلانی کے بیان میں یہ صورتحال سامنے آنے سے کیوں رہ گئی!" یہ صورتحال' جس کو ہم ابھی بیان کرتے ہیں جب حضرت امام کی علم میں آئی ہوگی تو کوئی وجہ نہیں کہ حسنی برادران والے اس خروج کی بھی نوعیت آپ کی تہ بیں نظر میں حضرت زید کے معاملہ سے زیادہ مختلف رہی ہو۔ اور اس کے بعد آپ کی جو کچھ بھی حمایت ومعاونت اس موقع پر امام ابراہیم کے حق میں رہی اس کی نوعیت بھی ٹھیک وہی سمجھی جانی چاہیے جو نوعیت حضرت زید کے ساتھ آپ کی معاونت کی تھی۔ بلکہ اس موقع کی معاونت کا ایک باعث یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ امام ابراہیم کی مدد کو آپ مظلوموں کی مدد کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہوں' اسلئے کہ ان کا سارا خاندان اس جرم میں قید وبند کے مصائب میں ڈالدیا گیا تھا کہ وہ اپنے عمزادگان کی دھوکہ دہی پر صبر کر لینے کو راضی نہ رہ سکا۔ اور اس ظلم کا تار ٹوٹنے کی صورت بظاہر صرف یہی تھی کہ ابراہیم کامیاب ہو جائیں۔۔ پس بالکل ممکن ہے کہ اس موقع پر جو حضرت امام کی مدد ومعاونت میں جو ایک جوش کی کیفیت کے شواہد مولانا گیلانی کے سامنے آئے ہیں ان کا باعث اس خاندان کی' جو کہ حضرت امام کا محبوب خاندان تھا' مظلومیت ہو۔

ہاں تو وہ صورتحال' جس کا مولانا گیلانی کے بیان میں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں آ سکا ہے' اور جس کا ہمارے خیال میں مولانا کی سوچ پر اثر پڑا۔ یہ تھی کہ حضرت محمد نفس زکیہ جو مہم کی اصل اساس تھے ان کی حمایت کے رجسٹر میں نام لکھانے والوں کی تعداد تو ایک لاکھ کو پہنچی تھی۔ مگر جب عمائد ومشائخ مدینہ کے نام ابوجعفر منصور کے خطوط پہنچنے شروع ہوئے تو حامیوں کے عزم میں فتور آنا شروع ہو گیا۔ حالانکہ حضرت امام مالک جیسے امام وقت فتویٰ دے رہے تھے کہ نفس زکیہ کا ساتھ دینا مطابق شریعت ہے اور پھر جب سیاسی تدبیروں سے زمین ہموار کر کے خلافت کا صرف چار ہزار کا لشکر مدینہ کے پاس اترا تو ان حامیوں کا دگرگوں حال دیکھ کر نفس زکیہ نے حضرت حسینؓ کی طرح خود ہی اعلان کرنا مناسب سمجھا کہ "میں تمام لوگوں کو اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں' اب جس کا جی چاہے میرا ساتھ دے' جو چاہے چھوڑ جائے اور اس اعلان کے بعد گنتی کے دو تین سو آدمی تھے جو آپ کے ساتھ رہ گئے اور پھر جب رن پڑا تو جیسے جیسے سرکاری فوج کا دباؤ بڑھتا گیا یہ آپ کو چھوڑ چھوڑ کے فرار ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ اپنی موت سے ہمکنار ہونے کو آپ اکیلے ہی میدان میں تھے۔ پس جب تحریک کے حامیوں کا حال اور معاملہ اس کے اصل مرکز میں اور تحریک کی اصل شخصیت کے ساتھ یہ تھا تو

بصرہ جو یونہی اتفاق سے امام ابراہیم کے وہاں پہنچ جانے پر ایک دوسرے مرکز اور اس کے قائد کی تائید وحمایت کے جو شواہد ملتے ہیں ان کی نوعیت وہی سمجھی جانی زیادہ قرین قیاس ہے جس نوعیت کی تائید وحمایت آپ کی طرف سے حضرت زید کو ملی تھی (اور یا وہ نوعیت جس کی طرف ہم نے ابھی اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا) اور اس کے بعد یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ آپ اگر اس موقع پر بھی ذاتی طور سے شریک نظر نہیں آتے تو اس کی کیا وجہ تھی۔

آمدم برسر مطلب: اب آیئے اس کہانی سے جو اصل مدعا اور مقصود تھا اس کی بات ہو۔ اسلامی دنیا کی اس وقت کی حکومتوں کا حال بالعموم انہیں احوال کا آئینہ دار ہے جن کی شکایت اموی اور عباسی حکومتوں کے بارے میں نقل ہوتی آرہی ہے۔ حساس حلقے اپنی ان حکومتوں کی تبدیلی کیلئے ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ سوچتے اور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے ان دنوں کے تازہ تر خاص حالات میں اس سوچ نے ''تحت یا تختہ'' والے انداز کار کا رجحان اختیار کرلیا ہے۔ حتی کہ خودکش بم دھماکے بھی اس راہ میں آزمائے جانے لگے اور اس رجحان کا حلقہ اثر وسیع ہوتا جارہا ہے۔ حضرت امام کی سیاسی زندگی کی یہ کہانی پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ اس میں تو ہمارے اس خاص دور ابتلاء وآزمائش کے لئے گویا ایک پیغام ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اسلامی دنیا کے مانے ہوئے آئمہ دین میں سے ہیں' پھر جن کا شمار ان حضرات میں کیا گیا ہے جو اس کے قائل تھے کہ اسلامی حکومت اگر ظالم وجابر اور فاسق وفاجر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے تو اسے بدلنے کیلئے طاقت کا استعمال جائز ہے۔ اور آپ کی زندگی کا یہ ریکارڈ جو مولانا گیلانیؒ کی کتاب نے ہمارے سامنے رکھا یہ اس کی تصدیق کررہا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے یہ بھی ہمارے سامنے آرہا ہے کہ وہ ایسے اقدام کیلئے ضروری سمجھتے تھے کہ اتنی طاقت مہیا ہو کہ اسباب معیار سے کامیابی کی توقع ممکن ہو۔ نہ یہ کہ بس راہ خدا میں شہادت نصیب ہوجائے۔ وہ شہادت کے قدرداں تھے اور انجام سے بے پرواہ ہوکر جان دے دینے والوں کو شہید ہی گردانتے تھے۔ مگر ان کا تفقہ زیادہ قیمتی بات اس کو سمجھتا تھا کہ آدمی مناسب تیاری کے ساتھ جان کی بازی لگائے الا یہ کہ اس پر حال طاری ہوگیا ہو' حضرت زید بن علی زین العابدینؒ کے معاملہ میں آپ کا طرز عمل اس کی ایسی مثال ہے کہ جو لوگ حضرت امام کی بات قابل توجہ سمجھتے ہیں ان کیلئے کچھ اور سوچنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ ذکر کیا جاچکا کہ اہل بیت سے عام حسن عقیدت کے علاوہ خود حضرت زید کا بڑا مرتبہ آپ کی نظر میں تھا۔ جس اموی حکومت کے خلاف وہ کھڑے ہونے جارہے تھے آپ بھی اس حکومت سے راضی نہ تھے۔ حضرت زید قاصد بھیج کر آپ سے اپنے ساتھ کھڑے ہونے کی خواہش کرتے ہیں۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں حضرت زید کے گرد جو چالیس ہزار کوفی آناً فاناً اکٹھے ہوگئے اور نعرے مار رہے ہیں یہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ یہ ہمیشہ کی طرح راہ میں دغا دیں گے۔ اس لئے ادب سے معذرت کردیتے ہیں۔ یہ معذرت آپ کو جتنی مشکل رہی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ مگر جس کے لئے امت کی امامت لکھ دی گئی ہو اسے تو وہی نقوش قدم ثبت کرنے تھے جن سے ابد تک کے لئے حکمت واعتدال کی راہ روشن ہے۔

سوال رہ جاتا ہے: حضرت امام حضرت زید کے جس خروج میں ساتھ دینے سے معذرت فرمارہے ہیں اس خروج

کوتو آپ نے خود اس نظر سے دیکھا تھا کہ ''گویا رسول اللہ ﷺ بدر کے لئے نکل رہے ہیں۔'' ایسے خروج میں شرکت سے معذرت کے کیا معنی اور کیونکر جواز؟ یہ سوال پہلے وہلہ میں جس قدر مشکل معلوم ہوتا ہے ایک لمحہ غور کے بعد اتنا ہی آسان ہوجاتا ہے۔ ہمارے ذہن میں چونکہ غزوہ بدر کے ساتھ عظمت وتقدس کا احساس بسا ہوا ہے اسلئے یہ نام آتا ہے تو اس احساس کو ساتھ لئے آتا ہے۔ اس بناء پر جیسے ہی ہم خروج حضرت زید کیلئے آنحضرت ﷺ کے خروج برائے بدر سے مشابہت کا کلمہ سنتے ہیں تو اس خروج کی بھی ایک گونہ عظمت اور تقدس کا تأثر پیدا ہوجاتا ہے۔ مگر پھر جیسا ہی ذہن اس طرف جائے گا کہ ساتھ دینے سے حضرت امام نے اس کے باوجود معذرت کی تو آدمی کو اپنے خیال پر خود ہی نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہوگی۔ کیونکہ ایسی بات تو ایک معمولی مسلمان سے بھی متوقع نہیں چہ جائے کہ ایک امام المسلمین سے کہ ایک مہم کو مانند غرور بدر سمجھیں اور شرکت سے معذرت خواہ ہوں! نیز اس معذرت میں آپ کا یہ فرمانا کہ آپ کے (یعنی حضرت زید کے) ساتھ کا دم بھرنے والے بھروسہ کے قابل نہیں ہیں۔ یہ تو اس حقیقت کو اور بھی واضح کئے دے رہا ہے کہ ایسے خروج کے لئے بدر والے خروج کی سی عظمت وتقدس کا احساس حضرت امام کے ذہن میں کہاں سے آسکتا تھا؟ اور تو اور، خود مولانا گیلانی کو بھی اول وہلہ میں حضرت امام کے اس قول کو خروج حضرت زید کے حق میں امام کا ''فتویٰ'' قرار دے کر معذرت نقل کرنے کے بعد کہنا پڑا ہے کہ امام صاحب اس تشبیہ میں شاید اس خروج کے اس انجام کی پیشین گوئی فرمارہے تھے کہ یہ چالیس پچاس ہزار بیعت کرنے والے آخر میں بس اتنے ہی بہ مشکل رہ جائیں گے جتنے آنحضرت ﷺ کے ساتھی بدر میں تھے۔

مولانا بڑے آدمی ہیں، ان کی بات بھی بڑی۔ مگر یہ بات فرمائی آپ نے امام صاحب کے قول کی ایک محض امکانی تأویل ہی کے درجہ میں اور امکانی تأویلات اور بھی ہوسکتی ہیں۔ مولانا کا ذہن شاید اس طرف نہیں گیا کہ جیسے بدر کے معرکہ کی صورت بے سان وگمان یکا یک پیدا ہوگئی تھی (ورنہ آنحضرت ﷺ مقام بدر کا قصد کسی دوسرے مقصد سے کر کے نکلے تھے) کچھ ایسی ہی صورت حضرت زید کے اس ارادہ خروج کی ہے کہ اتفاق سے کوفہ پہنچ گئے تھے اور یہاں کے لوگوں کی تحریک سے آناً فاناً معرکہ کارزار کی صورت بننے جارہی تھی۔ پس امام صاحب نے اس خروج کی خروج برائے بدر سے مشابہت کی جو بات فرمائی وہ اسی معنی میں تھی۔ نہ کہ اس معنی میں کہ یہ بھی ایسی ہی مقدس مہم ہے جیسی آنحضرت ﷺ کی بدر والی مہم۔ اور پھر شرکت سے معذرت میں حضرت امام نے جو وجہ بیان فرمائی (کہ حضرت زید کے ساتھ کا دم بھرنے والے بھروسہ کے قابل نہیں ہیں) اس میں تو حضرت امام گویا حضرت زید سے بھی باادب گزارش کررہے ہیں کہ ارادہ پر نظرِ ثانی فرمائیں! پھر کہاں رہ جاتا ہے وہ سوال کہ آپ نے شرکت کیوں نہ فرمائی؟

بہرحال امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کا سبق، ان کیلئے جو اس سے سبق لینا چاہیں، یہ ہے کہ سیاسی تبدیلیوں کے لئے ''خودکشی'' والے انداز جانبازی وجوانمردی ضرور مگر بارآور طریقے وہی ہیں جن پر حکمت وتدبر کی چھاپ ہو۔